کار کمپنیوں کا احتساب کون کرے گا؟

ملک میں گاڑیاں بنانے کی پانچ چھ کمپنیاں موجود ہیں۔ اکثریت کے پلانٹ کراچی میں واقع ہیں۔ گاڑیوں کے ناموں کے توسط سے پورا پاکستان ان کا نام جانتا ہے۔ مقامی مالکان بھی جانے پہچانے لوگ ہیں۔ اپنی اپنی کمپنیوں کے نمائندوں کی حیثیت سے پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ارب پتی نہیں بلکہ کھرب پتی ہیں۔ دولت کمانے میں کوئی ہرج نہیں مگر نظام کو اپنے مفاد کے لئے اختیارات اور تعلقات کے زور پر استعمال کرنا بہر حال حد درجہ نامناسب امر ہے۔ نامناسب کا لفظ احتیاط یا حفظ مراتب کے تحت استعمال کر رہا ہوں۔ ورنہ اگر یہ سب کچھ مہذب ملک میں ہوتا تو اسے سنگین معاشی جرم با آسانی کہا جا سکتا تھا۔ ان کے مالکان کی اکثریت شائد عدالتوں میں کیس بھگت رہی ہوتی یا پابند سلاسل ہوتی۔

غور فرمایئے! خود بھی گوگل پر تحقیق کیجئے۔ پاکستان میں ٹویوٹا ایٹلس کی قیمت پینتالیس لاکھ سے شروع ہوتی ہے اور 52 لاکھ پر ختم ہوتی ہے۔ دل تھام کر سنیئے کہ ہمارے ہمسایہ ملک میں اسی کرولا ایٹلس کی قیمت کیا ہے۔ دہلی میں اس گاڑی کی قیمت سولہ لاکھ سے شروع ہوتی ہے۔ بیس لاکھ پر اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ کہاں بیس لاکھ اور کہاں 52 لاکھ۔ جناب میں ایک ہی جیسی گاڑی کی بات عرض کر رہا ہوں۔ پاکستان میں کوئی طاقتور ادارہ یا سیاست دان اس کار کمپنی کے مالک سے پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ ہندوستان سے تگنی قیمت پر گاڑی عوام کو کیوں فروخت کر رہے ہیں۔ صرف ٹیوٹا کی بات نہیں کر رہا۔ ہنڈا سوک اوریل' اس وقت 54 لاکھ کی فروخت کی جا رہی ہے۔ بلکہ ہنڈا ٹر بو کار' اکسٹھ لاکھ میں بک رہی ہے۔ دہلی میں ہنڈا سوک کی قیمت سترہ لاکھ سے شروع ہو کر اکیس لاکھ تک ہے۔ سوچیئے کہ ہنڈا کمپنی' پاکستان میں اپنی گاڑی' ہمسایہ ملک سے تین سو گنا زیادہ قیمت پر فروخت کر رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ ان وجوہات کو جاننا از حد ضروری ہے۔ ہاں ایک بات بھول گیا دو سال پہلے۔ ہمارے ایک وفاقی وزیر نے نئی جیپیں درآمد کی تھیں۔ خان صاحب کے سابقہ سیکرٹری نے اس قریبی سیاست دان کی گاڑیوں پر وقتی طور پر امپورٹ ڈیوٹی اور ٹیکس اتنے کم کر دیئے کہ سرکار کو اربوں روپے کا ٹیکہ آسانی سے لگا دیا گیا۔ اور اس طرح خود بے حساب ناجائز دولت کمالی۔ آج وہ سابقہ بیوروکریٹ اور سابقہ وزیر صاحب سارا دن میرٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ اگر حکومت وقت صرف اس جیپ سکینڈل پر گرفت کر لے تو میرٹ اور شفافیت کا ڈھول یکدم پھٹ جائے گا۔ بہر حال یہاں نہ کسی نے پوچھنا ہے اور نہ ہی کسی کی اس میں کوئی دلچسپی ہے۔ دہاڑی دار بابو اور سیاست دان ہر دور کی طرح پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ سنا ہے کہ وہ سابقہ اہم ترین بابو' ملک سے فرار ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ مگر جس طرح کار کمپنیوں کے مالکان اور حکومتی حلقے مل کر عوام کو منظم طریقے سے لوٹ رہے ہیں۔ یہ بذات خود ایک مہیب جرم ہے۔ کیونکہ اس ملک میں ہر جرم معاف ہے' لہٰذا اس منظم جرم کو تو پوچھنے کی ہمت تک کوئی نہیں کر سکتا۔

معاملہ اگر صرف حد درجہ مہنگی گاڑیوں کی فروخت تک محدود رہتا تو جرم کی ہیئت کچھ کم ہو سکتی تھی۔ مگر یقین فرمایئے۔ آپ لوہے کی نہیں' بلکہ پلاسٹک اور ٹین کی گاڑیاں خرید رہے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ کسی پرانی جرمن یا انگلش گاڑی پر ہلکی سے ضرب لگائیں۔ ان کی چادر کو کچھ نہیں ہوگا۔ پھر آپ پاکستانی گاڑی کو ہلکا سا مکہ ہی مار دیجئے۔ اس میں دو چار ڈینٹ پڑ جائیں گے۔ ہماری مقامی گاڑیاں حد درجہ غیر معیاری ثابت ہوتی ہیں۔ یعنی ایک تو حد درجہ ہولناک لوٹ مار اور پھر غیر معیاری میٹریل کا استعمال۔ نتیجہ کیا ہے۔ روز' ہر لمحہ سڑکوں پر عام لوگوں کے لئے موت رقصاں رہتی ہے۔ ہماری گاڑیاں چلتی پھرتی موت ہیں۔ حادثہ کے دوران' حفاظتی ائر بیگ تک نہیں کھلتے۔ چلانے والا صرف اور صرف اس حفاظتی ائر بیگ نہ کھلنے کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ کیا آج تک کسی حکومتی ادارے نے ان کمپنیوں پر گرفت کی ہے کہ جناب حادثہ کے وقت آپ کا حفاظتی نظام اتنا ناکارہ کیوں تھا کہ کام ہی نہ کر پایا۔ نہیں صاحب۔ لوگ کیڑے مکوڑے کی طرح روز مرتے جاتے ہیں۔ مگر ان مگرمچھوں سے معمولی سی پوچھ گچھ بھی کوئی نہیں کر پائے گا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کمپنیاں بالائی سطح پر ہر ایک سے اس کے عہدہ کے لحاظ سے ''شفقت'' فرماتی ہیں۔ ان کی محبت اور عشق کی کوئی بابو بھی تاب نہیں لا سکتا۔ یعنی اگر ریگولیٹر اور کار کمپنیاں آپس میں ''حسن سلوک'' سے رہنا شروع ہو جائیں تو عوام کے مفاد تو گئے چولہے میں۔ عام آدمی کی پرواہ نہ کسی حکومت کو ہوتی ہے اور نہ ہی کسی ادارے کو۔ ہاں باتیں' تقاریر اور بھاشن تو خیر بنے ہی عام لوگوں کے لئے ہیں۔ فوائد اور مزے صرف اور صرف خواص تک ہی محدود ہیں۔

آپ کے سامنے ایک محیر العقول مالیاتی جرم رکھتا ہوں۔ مختلف کار کمپنیوں نے اپنی اپنی ایجنسیاں ہر شہر اور قصبے میں مقرر کی ہوئی ہیں۔ یہ بالکل درست قدم ہے۔ کیونکہ کار ڈیلر کے بغیر کسی بھی گاڑی کو بیچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اب واردات کیسے ہوتی ہے۔ صارف سے کسی بھی کار کی مکمل قیمت' پہلے وصول کی جاتی ہے۔ اس کے بعد زبانی کلامی کہا جاتا ہے کہ جناب آپ کی گاڑی' تین ماہ یا دو ماہ کی مدت میں آ جائے گی۔ یہ مکمل فریب ہوتا ہے۔ مقررہ مہینہ میں اگر ڈیلر سے دریافت کریں کہ گاڑی جس کے پیسے کمپنی آپ سے پہلے وصول کر چکی ہے' کب ملے گی۔ تو جواب ہوگا کہ بس پندرہ بیس دن مزید لگیں گے۔ یہ وقت بڑھتے بڑھتے دو تین مہینے تک طویل ہو سکتا ہے۔ یہ غیر معمولی طوالت کمپنی کے لئے سونے کی کان ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی بھی کار کمپنی نے پورے ملک سے سوا ارب روپے ایڈوانس اکٹھے کیے ہیں اور ان کو پانچ چھ ماہ خود استعمال کیا ہے یا کسی بینک میں رکھوایا ہے تو اس کا ماہانہ سود کروڑوں روپے بنتا ہے۔ یعنی پیسے لوگوں کے اور منافع نہیں' بلکہ منافع پلس منافع بلا وجہ' کمپنی مالکان کا۔ اگر صرف معروضی طور پر پانچ چھ کامیاب کمپنیوں کے صرف اس ناجائز منافع کا تخمینہ لگائیں تو آپ کو غش پڑ جائے گا۔ عوام کے پیسوں سے ناجائز ترین طور پر اربوں روپے کا منافع کما رہے ہیں۔ گزشتہ چار ماہ میں تو ایک کمپنی نے کمال کیا ہے۔ مکمل رقم لینے کے بعد صارفین سے دو بار' پندرہ لاکھ روپے وصول کیے۔ اور پھر اعلان کر دیا کہ پلانٹ کیونکہ دو ہفتہ بند رہا ہے۔ لہٰذا اب آپ کی گاڑی تین ماہ تاخیر سے آئے گی۔ منظم ترین مالیاتی جرم کی نوعیت دیکھئے کہ ڈالر کی قیمت بڑھنے کے پیسے بھی ایڈوانس وصول کر لئے۔ اسے بینکوں میں تین ماہ رکھوا کر کروڑوں روپیہ بھی حاصل کیا۔ اور پھر صارفین کی جیبیں کاٹنے کے بعد جعلی مجبوریاں بھی سامنے رکھنی شروع کر دیں۔ اب ایک آدمی جو کار کی ساری رقم بلکہ اضافی رقم' پیشگی جمع کروا چکا ہے' وہ صبر کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے۔ پورے ملک میں ایک بھی ایسا فورم نہیں جہاں' اس ڈاکہ کی شکایت کی جا سکے۔

چند دن پہلے' ایک نجی کمپنی کے سینئر عہدیداروں نے پنجاب سے تعلق رکھنے والی اہم خاتون سیاست دان سے ملاقات کی۔ اس کی تصاویر اخبار میں شائع ہوئیں۔ ملاقات میں کمپنی کی جانب سے قیمتی ترین تحائف بھی دیئے گئے۔ تمام تفصیل بھی پریس میں موجود ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک ایسی کار کمپنی جو ہمارے ملک کو اربوں روپے کا چونا لگا رہی ہے۔ حد سے زیادہ عوامی استحصال کر رہی ہے۔ کیا ہماری صف اول کی خاتون سیاست دان کو ان بحری قزاقوں سے ملنا چاہیے تھا؟ کسی بھی زاویہ سے دیکھ لیجئے۔ یہ ملاقات نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ ہمارے قائدین کو احساس ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ فوٹو سیشن' عام آدمی کے لئے کتنے آزار کا باعث بنے گا۔ مگر اخلاقی' سفارتی اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ڈنکے کی چوٹ پر یہ ملاقات ہوئی۔ خوش گپیوں کا تبادلہ ہوا۔ اور عوام کو کمپنی کی طرف سے یہ بلا واسطہ پیغام ملا کہ جناب' آپ جو مرضی کر لیں۔ ہم متعین وقت پر نہ آپ کو گاڑی دینگے اور جایئے آپ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ ملک کے طاقت ور ترین طبقہ تک ہماری رسائی ہے۔ کیا یو کے یا امریکہ یا سویڈن میں اس طرح کی استحصالی کمپنیوں کے عہدہ داران' وہاں کے اہم سیاست دانوں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں اگر اس طرز کی ملاقات پریس میں لیک ہو جائے تو اس سیاست دان کو کم از کم استعفیٰ دینا پڑے گا۔ مگر یہاں چوری بھی سر عام ہوتی ہے اور تحفظ بھی ببانگ دہل کیا جاتا ہے۔

حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ ہماری اعلیٰ ترین عدالتیں بھی اس ساری صورت حال کو خاموشی سے برداشت کر رہی ہیں۔ نیب جیسا ادارہ بھی مکمل طور پر خاموش ہے۔ عوام کی تکلیف اور ان کے جائز پیسوں کی لوٹ مار کے خلاف کسی قسم کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ہر طرف ایک سکوت ہے۔ اور عوام ہے کہ دن دھاڑے لٹ رہے ہیں۔ ان کے حقوق کا تحفظ کون کرے گا۔ مجھے تو خیر دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آتا۔